افسانہ

اردو میں افسانے کا باقاعدہ آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہوا۔ ناول کی طرح اس صنف پر بھی مغربی ادب کا گہرا اثر ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دینے اور مصروف رہنے والوں کے لیے مختصر افسانہ، ناول اور داستان سے زیادہ کشش رکھتا ہے۔

مختلف نقّادوں نے افسانے کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں۔ ایک نقّاد نے کہا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جا سکے۔ ایک اور نقّاد کا قول ہے کہ افسانے میں بنیادی چیز وحدتِ تاثر ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ افسانے کی شکل بھی تبدیل ہوئی ہے۔

ایک اچھّا افسانہ اختصار کے ساتھ زندگی کے کسی گوشے کو قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ مختصر ہونے کی وجہ سے کہانی میں جھول پیدا ہونے کا اندیشہ بھی کم ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کا مشاہدہ اور انسانی نفسیات کا مطالعہ گہرا ہونا چاہیے۔ کردار اور واقعات ایسے ہوں جو ہماری زندگی اور ہمارے تجربوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔

اردو کے افسانہ نگاروں میں پریم چند، علی عباس حسینی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، غلام عباس، قرۃالعین حیدر اور انتظار حسین بہت اہم ہیں۔

© NCERT not to be republished

پریم چند

(1880ء – 1936ء)

منشی پریم چند کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ انھوں نے نواب رائے کے نام سے کچھ افسانے لکھے، پھر 1910ء میں پریم چند نام اختیار کیا اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ وہ بنارس کے قریب ایک گاؤں لمہی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی عجائب لال ڈاک کے محکمہ میں کلرک تھے۔ پریم چند آٹھ سال کے تھے کہ ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ جب وہ پندرہ سال کے ہوئے تو ان کے باپ نے ان کی شادی کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں انٹر پاس کرنے کے بعد اپنی تعلیم چھوڑ دینی پڑی۔ انھوں نے محکمۂ تعلیم میں نوکری کر لی۔ سرکاری ملازمت کی وجہ سے حق بات کے اظہار میں رکاوٹ محسوس ہوئی تو ملازمت ترک کر کے ساری زندگی تصنیف و تالیف کے کاموں میں صَرف کر دی۔

پریم چند نے تقریباً ساڑھے تین سو افسانے اور بارہ ناول لکھے۔ انھیں اردو افسانے کا موجد نہیں تو پہلا بڑا افسانہ نگار ضرور کہا جا سکتا ہے اور اکثر لوگوں کے خیال میں وہ اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار بھی ہیں۔ انھوں نے مختصر افسانے کو ایک معیار عطا کیا۔ ان کے افسانے اور ناول اُردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ ان کے مجموعوں میں 'واردات'، 'پریم پچّیسی'، 'پریم بتّیسی'، 'آخری تحفہ'، 'نجات' اور 'زادِ راہ' قابل ذکر ہیں اور ان کے ناولوں میں 'چوگانِ ہستی'، 'میدانِ عمل'، 'بیوہ'، 'بازارِ حُسن' اور 'گئو دان' ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

© NCERT not to be republished

پریم چند کے ناول اور افسانے بے مثل حقیقت نگاری کا نمونہ ہیں۔ ان کے افسانوں کا پس منظر مشرقی یوپی کا دیہات ہے۔ ہندوستانی کسان اپنی پوری شخصیت کے ساتھ پریم چند کی تصانیف میں نظر آتا ہے۔ پریم چند کی نثر سادہ اور آسان ہے۔ اپنے اندازِ بیان سے انھوں نے افسانوں کو بہت پُر لطف بنا دیا ہے۔

© NCERT not to be republished

حجِ اکبر

منشی صابر حسین کی آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ، اپنے بچّہ کے لیے دایہ رکھنا گوارا نہیں کر سکتے تھے، لیکن ایک تو بچّہ کی صحت کی فکر اور دوسرے اپنے برابر والوں سے ہیٹے بن کر رہنے کی ذلّت اس خرچ کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ بچّہ دایہ کو بہت چاہتا تھا۔ ہر دم اس کے گلے کا ہار بنا رہتا تھا۔ اس وجہ سے دایہ اور بھی ضروری معلوم ہوتی تھی۔ مگر شاید سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ مروّت کے باعث دایہ کو جواب دینے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ بڑھیا ان کے یہاں تین سال سے نوکر تھی۔ اس نے ان کے اکلوتے بچّے کی پرورش کی تھی۔ اپنا کام دل وجان سے کرتی تھی۔ اسے نکالنے کا کوئی حیلہ نہ تھا اور خواہ مخواہ کیڑے نکالنا صابر جیسے حلیم شخص کے لیے غیر ممکن تھا۔ مگر شاکرہ اس معاملہ میں اپنے شوہر سے متّفق نہ تھی۔ اسے شک تھا کہ دایہ ہم کو لوٹے لیتی ہے۔ جب دایہ بازار سے لوٹتی تو وہ دہلیز میں چھپی رہتی کہ دیکھوں آٹا چھپا کر تو نہیں رکھ دیتی۔ لکڑی تو نہیں چھپا دیتی۔ اس کی لائی ہوئی ہر چیز کو گھنٹوں دیکھتی — بار بار پوچھتی اتنا ہی کیوں؟ کیا بھاؤ ہے؟ کیا اتنا مہنگا ہو گیا؟ دایہ کبھی تو ان بدگمانیوں کا جواب ملائمیت سے دیتی۔ لیکن جب بیگم زیادہ تیز ہو جاتیں تو وہ بھی کڑی پڑ جاتی تھی۔ قسمیں کھاتی۔ صفائی کی شہادتیں پیش کرتی۔ تردید اور حجّت میں گھنٹوں لگ جاتے۔ قریب قریب روزانہ یہی کیفیت رہتی تھی اور روز یہ ڈراما دایہ کی خفیف سی اشک ریزی کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ دایہ کا اتنی سختیاں جھیل کر پڑے رہنا شاکرہ کے شکوک کی آبیاری کرتا تھا۔ اسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ بُڑھیا محض بچّے کی محبّت سے پڑی ہوئی ہے۔ وہ دایہ کو ایسے لطیف جذبہ کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔

اتّفاق سے ایک روز دایہ کو بازار سے لوٹنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہاں دو کنجڑنوں میں بڑے جوش وخروش سے مناظرہ تھا۔ ان کا مصور طرز ادا، ان کا اشتعال انگیز استدلال، ان کی متشکل

© NCERT not to be republished

تضحیک، ان کی روشن شہادتیں اور منور روایتیں، ان کی تعریض اور تردید بے مثال تھیں۔ زہر کے دو دریا تھے یا دو شعلے جو دونوں طرف سے امڈ کر باہم گتھ گئے تھے۔ کیا روانیِ زبان تھی! گویا کوزے میں دریا بھرا ہو۔ ان کا جوشِ اظہار ایک دوسرے کے بیانات کو سننے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ان کے الفاظ کی ایسی رنگینی، تخیل کی ایسی نوعیت، اسلوب کی ایسی جدّت، مضامین کی ایسی آمد، تشبیہات کی ایسی موزونیت اور فکر کی ایسی پرواز پر ایسا کون سا شاعر ہے جو رشک نہ کرتا۔ صفت یہ تھی کہ اس مباحثہ میں تلخی یا دلآویزی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ دونوں بُلبلیں اپنے اپنے ترانوں میں محو تھیں۔ ان کی متانت، ان کا ضبط، ان کا اطمینانِ قلب حیرت انگیز تھا۔ ان کے ظرفِ دل میں اس سے کہیں زیادہ کہنے کی اور بدرجہا زیادہ سننے کی گنجائش معلوم ہوتی تھی۔ الغرض یہ خالص دماغی ذہنی مناظرہ تھا۔ اپنے اپنے کمالات کے اظہار کے لیے ایک خالص زور آزمائی تھی اپنے اپنے کرتب اور فن کے جوہر دکھانے کے لیے۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ وہ مبتذل کنایات و اشارے جن پر بےشرمی کو شرم آتی اور کلماتِ رکیک جن سے عفونت بھی دور بھاگتی، ہزاروں رنگین مزاجوں کے لیے محض باعث تفریح تھے۔

دایہ بھی کھڑی ہوگئی کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے، پر تماشا اتنا دلآویز تھا کہ اسے وقت کا مطلق احساس نہ ہوا۔ یکا یک نو بجنے کی آواز کان میں آئی تو سحر ٹوٹا۔ وہ لپکی ہوئی گھر کی طرف چلی۔

شاکرہ بھری بیٹھی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی — ''کیا بازار میں کھوگئی تھیں؟ دایہ نے خطاوارانہ انداز سے سر جُھکا لیا اور بولی ''بیوی ایک جان پہچان کی ماما سے ملاقات ہوگئی اور باتیں کرنے لگی۔''

شاکرہ جواب سے اور بھی برہم ہوئی۔ یہاں دفتر جانے کو دیر ہو رہی ہے تمھیں سیر سپاٹے کی سوجھی ہے۔ مگر دایہ نے اس وقت دبنے میں خیریت سمجھی۔ بچّہ کو گود میں لینے چلی۔ پر شاکرہ نے جھڑک کر کہا۔ ''رہنے دو۔ تمھارے بغیر بےحال نہیں ہوا جاتا۔''

دایہ نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی بیگم صاحبہ کا غصّہ فرو کرنے کی اس سے زیادہ کارگر

© NCERT not to be republished

کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی۔ اس نے نصیر کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ دایہ نے اسے گود میں اٹھالیا۔ اور دروازہ کی طرف چلی لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی اور نصیر کو اس کی گود سے چھین کر بولی۔ ''تمہارا یہ مکر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ یہ تماشے کسی اور کو دکھایئے۔ یہاں طبیعت سیر ہوگئی۔''

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان یہ ایسا مضبوط تعلق تھا جسے معمولی ترشیاں کمزور نہ کرسکتی تھیں۔ اسی وجہ سے باوجود شاکرہ کی سخت زبانیوں کے اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ واقعی مجھے نکالنے پر آمادہ ہے۔ پر شاکرہ نے یہ باتیں کچھ اس بے رخی سے کیں اور بالخصوص نصیر کو اس بے دردی سے چھین لیا کہ دایہ سے ضبط نہ ہوسکا۔ بولی۔ ''بیوی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی۔ بہت ہوگا تو پاؤ گھنٹہ کی دیر ہوئی ہوگی۔ اس پر آپ اتنا جھلّا رہی ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ دوسرا دروازہ دیکھو۔ اللہ نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی دے گا۔ مزدوری کا کال تھوڑا ہی ہے۔''

شاکرہ: ''تو یہاں تمھاری کون پروا کرتا ہے۔ تمھاری جیسی مامائیں گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔''

دایہ: ''ہاں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ مامائیں، دائیاں بہت ملیں گی۔ جو کچھ خطا ہوئی ہو۔ معاف کیجیے گا۔ میں جاتی ہوں۔''

شاکرہ: ''جا کر مردانے میں اپنی تنخواہ کا حساب کرلو۔''

دایہ: ''میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائیاں منگوا دیجیے گا۔''

اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آگئے۔ پوچھا۔ ''کیا ہے؟''

دایہ: ''کچھ نہیں۔ بیوی نے جواب دے دیا ہے۔ گھر جاتی ہوں۔''

صابر حسین خانگی تردّدات سے یوں بچتے تھے جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے بچے۔ انھیں سارے دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنا منظور تھا۔ پر کانٹوں میں پیر رکھنے کی جرأت نہ تھی۔ چیں بہ جبیں ہوکر بولے۔ ''کیا بات ہوئی؟''

© NCERT not to be republished

شاکرہ: ''کچھ نہیں۔ اپنی طبیعت۔ نہیں جی چاہتا نہیں رکھتے۔ کسی کے ہاتھوں بِک تو نہیں گئے۔''

صابر: ''تمھیں بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کھچڑ سوجھتی رہتی ہے۔''

شاکرہ: ''ہاں مجھے تو اس بات کا جنون ہے۔ کیا کروں؟ خصلت ہی ایسی ہے۔ تمھیں یہ بہت پیاری ہے۔ تو لیجا کر گلے باندھو! میرے یہاں ضرورت نہیں ہے۔''

دایہ گھر سے نکلی تو اس کی آنکھیں لبریز تھیں۔ دل نصیر کے لیے تڑپ رہا تھا کہ ایک بار بچّے کو گود میں لے کر پیار کرلوں۔ پر یہ حسرت لیے اسے گھر سے نکلنا پڑا۔

نصیر دایہ کے پیچھے پیچھے دروازہ تک آیا لیکن جب دایہ نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تو مچل کر زمین پر لیٹ گیا۔ اور انّا انّا کہہ کر رونے لگا۔ شاکرہ نے چمکارا پیار کیا۔ گود میں لینے کی کوشش کی۔ مٹھائی کا لالچ دیا۔ میلہ دکھانے کا وعدہ کیا۔ اس سے کام نہ چلا تو بندر اور سپاہی اور لُولُو اور ہوّا کی دھمکی دی۔ مگر نصیر پر مطلق اثر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ شاکرہ کو غصّہ آ گیا۔ اس نے بچّہ کو وہیں چھوڑ دیا۔ اور آ کر گھر کے دھندوں میں مصروف ہوگئی۔ نصیر کا منھ اور گال لال ہو گئے۔ آنکھیں سوج گئیں۔ آخر وہ وہیں زمین پر سسکتے سسکتے سو گیا۔

شاکرہ نے سمجھا تھا تھوڑی دیر میں بچّہ رو دھو کر چُپ ہو جائے گا۔ پر نصیر نے جاگتے ہی پھر انّا کی رٹ لگائی۔ تین بجے صابر حسین دفتر سے آئے اور بچّے کی یہ حالت دیکھی تو بیوی کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر اسے گود میں اٹھالیا۔ اور بہلانے لگے۔ آخر نصیر کو جب یقین ہو گیا کہ دایہ مٹھائی لینے گئی تو اسے تسکین ہوئی۔ مگر شام ہوتے ہی اس نے پھر چیخنا شروع کیا۔ ''انّا مٹھائی لائی؟''

اس طرح دو تین دن گزر گئے۔ نصیر کو انّا کی رٹ لگانے اور رونے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ وہ بے ضرر کُتّا جو ایک لمحہ کے لیے اس کی گود سے جدا نہ ہوتا تھا۔ وہ بے زبان بلّی جسے طاق پر بیٹھے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ طائرِ بے پرواز جس پر وہ جان دیتا تھا۔ سب اس کی نظروں

سے گر گئے۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ انّا جیسی جیتی جاگتی پیار کرنے والی، گود میں لے کر گھمانے والی، تھپک تھپک کر سلانے والی، گا گا کر خوش کرنے والی چیز کی جگہ ان بے جان، بے زبان چیزوں سے پُر نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اکثر سوتے سوتے چونک پڑتا اور انّا انّا پکار کے رونے لگتا۔ کبھی دروازہ پر جاتا اور انّا انّا پکار کر ہاتھوں سے اشارہ کرتا۔ گویا اسے بلا رہا ہے۔ انّا کی خالی کوٹھری میں جا کر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اسے امّید ہوتی تھی کہ انّا یہاں آتی ہوگی۔ اس کوٹھری کا دروازہ بند پاتا تو جا کر کواڑ کھٹکھٹاتا کہ شاید انّا اندر چھپی بیٹھی ہو۔ صدر دروازہ کھُلتے سنتا تو انّا انّا کہہ کر دوڑتا۔ سمجھتا کہ انّا آ گئی۔ اس کا گدرایا ہوا بدن گھُل گیا۔ گلاب کے سے رخسار سوکھ گئے۔ ماں اور باپ دونوں اس کی موہنی ہنسی کے لیے ترس ترس کر رہ جاتے۔ اگر بہت گدگدانے اور چھیڑنے سے ہنستا بھی تو ایسا معلوم ہوتا دل سے نہیں محض دل رکھنے کے لیے ہنس رہا ہے۔ اسے اب دودھ سے رغبت تھی نہ مصری سے، نہ میوہ سے، نہ میٹھے بسکٹ سے، نہ تازی امرتیوں سے۔ ان میں مزہ تھا جب انّا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھی۔ اب ان میں مزہ نہ تھا۔ دو سال کا ہونہار لہلہاتا ہوا شاداب پودا مرجھا کر رہ گیا۔ وہ لڑکا جسے گود میں اٹھاتے ہی نرمی، گرمی اور وزن کا احساس ہوتا تھا۔ اب استخواں کا ایک پُتلا رہ گیا تھا۔ شاکرہ بچّہ کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی اور اپنی حماقت پر پچھتاتی۔ صابر حسین جو فطرتاً خلوت پسند آدمی تھے۔ اب نصیر کو گود سے جدا نہ کرتے تھے۔ اسے روز ہوا کھلانے جاتے، نت نئے کھلونے لاتے۔ پر مرجھایا ہوا پودا کسی طرح نہ پنپتا تھا۔ دایہ اس کی دنیا کا آفتاب تھی۔ اس قدرتی حرارت اور روشنی سے محروم ہو کر سبزہ کی بہار کیوں کر دکھاتا؟ دایہ کے بغیر اسے چاروں طرف اندھیرا، سنّاٹا نظر آتا تھا۔ دوسری انّا تیسرے ہی دن رکھ لی تھی۔ پر نصیر اس کی صورت دیکھتے ہی منہ چھپا لیتا تھا۔ گویا وہ کوئی دیونی یا بھُتنی ہے۔

عالمِ وجود میں دایہ کو نہ دیکھ کر نصیر اب زیادہ تر عالمِ خیال میں رہتا۔ وہاں اس کی اپنی انّا چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ اس کی وہی گود تھی۔ وہی محبت، وہی پیاری باتیں، وہی پیارے پیارے گیت، وہی مزے دار مٹھائیاں، وہی سہانا سنسار، وہی دلکش لیل ونہار، اکیلے بیٹھے انّا سے باتیں

کرتا۔ انّا کتا بھونکے۔ انّا گائے دودھ دیتی۔ انّا اجلا اجلا گھوڑا دوڑتا۔ سویرا ہوتے ہی لوٹا لے کر دایہ کی کوٹھری میں جاتا اور کہتا۔ ''انّا پانی پی'' دودھ کا گلاس لے کر اس کی کوٹھری میں رکھ آتا اور کہتا۔ ''انّا دودھ پلا—'' اپنی چارپائی پر تکیہ رکھ کر چادر سے ڈھانک دیتا اور کہتا۔ ''انّا سوتی'' شاکرہ کھانے بیٹھتی تو رکابیاں اٹھا اٹھا انّا کی کوٹھری میں لے جاتا اور کہتا ''انّا کھانا کھائے گی'' انّا اس کے لیے اب ایک آسمانی وجود تھی جس کی واپسی کی اسے مطلق امید نہ تھی۔ وہ محض گزشتہ خوشیوں کی دلکش یادگار تھی جس کی یاد ہی اس کا سب کچھ تھی۔ نصیر کے انداز میں رفتہ رفتہ طفلانہ شوخی اور بیتابی کی جگہ ایک حسرت ناک توکّل، ایک مایوسانہ خوشی نظر آنے لگی۔ اس طرح تین ہفتے گزر گئے۔ برسات کا موسم تھا۔ کبھی شدت کی گرمی، کبھی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے، بخار اور زکام کا زور تھا۔ نصیر کی نقاہت اس موسمی تغیّرات کو برداشت نہ کر سکی۔ شاکرہ احتیاطاً اسے فلالین کا کرتا پہنائے رکھتی۔ اسے پانی کے قریب نہ جانے دیتی۔ ننگے پاؤں ایک قدم نہ چلنے دیتی۔ مگر رطوبت کا اثر ہو ہی گیا۔ نصیر کھانسی اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔

صبح کا وقت تھا۔ نصیر چارپائی پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کا علاج بے سود ہو رہا تھا۔ شاکرہ چارپائی پر بیٹھی اس کے سینے پر تیل کی مالش کر رہی تھی اور صابر حسین صورتِ غم بنے ہوئے بچّہ کو پُر درد نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس طرف وہ شاکرہ سے بہت کم بولتے تھے۔ انھیں اس سے ایک نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ نصیر کی اس بیماری کا سارا الزام اسی کے سر رکھتے تھے۔ وہ ان کی نگاہوں میں نہایت کم ظرف، سفلہ مزاج، بے حس عورت تھی۔

شاکرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ '' آج بڑے حکیم صاحب کو بُلا لیتے۔ شاید انھیں کی دوا سے فائدہ ہو'' صابر حسین نے کالی گھٹاؤں کی طرف دیکھ کر تُرشی سے جواب دیا۔

''بڑے حکیم نہیں۔ لقمان بھی آئیں تو اسے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔''

شاکرہ: ''تو کیا اب کسی کی دوا ہی نہ ہوگی؟''

صابر: ''بس اس کی ایک ہی دوا ہے اور وہ نایاب ہے۔''

شاکرہ : ''تمھیں تو وہی دُھن سوار ہے۔کیا عبّاسی امرت پلا دے گی؟''

صابر : ''ہاں وہ تمھارے لیے چاہے زہر ہو۔لیکن بچّے کے لیے امرت ہی ہوگی۔''

شاکرہ : ''میں نہیں سمجھتی کہ اللہ کی مرضی میں اسے اتنا دخل ہے۔''

صابر : ''اگر نہیں سمجھتی ہو اور اب تک نہیں سمجھا تو روؤ گی۔بچّے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔''

شاکرہ : ''چپ بھی رہو۔کیسا شگون زبان سے نکالتے ہو اگر ایسی جلی کٹی سنانی ہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔''

صابر : ''ہاں تو میں جاتا ہوں۔مگر یاد رکھو یہ خون تمھاری گردن پر ہوگا۔اگر لڑکے کو پھر تندرست دیکھنا چاہتی ہو تو اس عبّاسی کے پاس جاؤ۔اس کی منّت کرو۔التجا کرو۔تمھارے بچّے کی جان اسی کے رحم وکرم پر منحصر ہے۔''

شاکرہ نے کچھ جواب نہ دیا۔اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صابر حسین نے پوچھا۔''کیا مرضی ہے۔جاؤں،اسے تلاش کروں؟''

شاکرہ : ''تم کیوں جاؤ گے۔میں خود چلی جاؤں گی۔''

صابر : ''نہیں معاف کرو۔مجھے تمھارے اوپر اعتبار نہیں ہے۔نہ جانے تمھارے منھ سے کیا نکل جائے کہ وہ آتی بھی ہو تو نہ آئے۔''

شاکرہ نے شوہر کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر کہا۔''ہاں اور کیا! مجھے اپنے بچّے کی بیماری کا قلق تھوڑے ہی ہے۔میں نے شرم کے مارے تم سے کہا نہیں لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا ہے۔اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتہ معلوم ہوتا تو میں اسے کب کی منالائی ہوتی۔وہ مجھ سے کتنی ہی ناراض ہو لیکن نصیر سے اسے محبّت تھی۔میں آج ہی اس کے پاس جاؤں گی۔اس کے قدموں کو آنسوؤں سے تر کر دوں گی۔اور وہ جس طرح راضی ہوگی اسے راضی کروں گی۔''

شاکرہ نے بہت ضبط کر کے یہ باتیں کہیں۔مگر اُمڈے ہوئے آنسو اب نہ رک سکے۔

صابر حسین نے بیوی کی طرف ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا اور نادم ہوکر بولے۔ ''میں تمھارا جانا مناسب نہیں سمجھتا، خود ہی جاتا ہوں۔''

عبّاسی دنیا میں اکیلی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز شاداب درخت تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خزاں نے سب پتّیاں گرادیں۔ بادِحوادث نے درخت کو پامال کردیا۔ اور اب یہی سوکھی ٹہنی ہرے بھرے درخت کی یادگار باقی تھی۔

مگر نصیر کو پاکر اس کی سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اس میں ہری ہری پتّیاں نکل آئی تھیں۔ وہ زندگی جو اب تک خشک اور پامال تھی۔ اس میں پھر رنگ و بو کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اندھیرے بیاباں میں بھٹکے ہوئے مسافر کو شمع کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اب اس کا جوئے حیات سنگ ریزوں سے نہ ٹکراتا تھا۔ وہ اب ایک گلزار کی آبیاری کرتا تھا۔ اب اس کی زندگی مہمل نہیں تھی۔ اس میں معنی پیدا ہو گئے تھے۔

عبّاسی نصیر کی بھولی بھولی باتوں پر نثار ہو گئی۔ مگر وہ اپنی محبّت کو شاکرہ سے چُھپاتی تھی۔ اس لیے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو۔ وہ نصیر کے لیے ماں سے چُھپ کر مٹھائیاں لاتی اور اسے کِھلا کر خوش ہوتی۔ وہ دن میں دو دو تین تین بار اسے ابٹن ملتی کہ بچّہ خوب پروان چڑھے۔ وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی کہ بچّے کو نظر نہ لگ جائے۔ ہمیشہ دوسروں سے بچّے کی کم خوری کا رونا رویا کرتی۔ اسے نظر بد سے بچانے کے لیے تعویذ اور گنڈے لاتی رہتی۔ یہ اس کی خالص مادرانہ محبّت تھی۔ جس میں اپنے روحانی احتظاظ کے سوا اور کوئی غرض نہ تھی۔

اس گھر سے نکل کر آج عبّاسی کی وہ حالت ہو گئی جو تھیٹر میں یکا یک بجلیوں کے گل ہو جانے سے ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی صورت ناچ رہی تھی۔ کانوں میں وہی پیاری پیاری باتیں گونج رہی تھیں، اسے اپنا گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ اس کال کوٹھری میں دم گھٹا جاتا تھا۔

رات جوں توں کر کے کٹی۔ صبح کو وہ مکان میں جھاڑو دے رہی تھی۔ یکا یک تازے حلوے کی صدا سن کر بے اختیار باہر نکل آئی۔ معاً یاد آ گیا۔ آج حلوہ کون کھائے گا؟ آج گود میں بیٹھ کر

کون چہکے گا۔ وہ نغمۂ مسرت سُننے کے لیے، جو حلوہ کھاتے وقت نصیر کی آنکھوں سے، ہونٹوں سے، اور جسم کے ایک ایک عضو سے برستا تھا، عبّاسی کی روح تڑپ اٹھی۔ وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلی کہ چلوں۔ نصیر کو دیکھ آؤں، پر آدھے راستہ سے لوٹ گئی۔

نصیر عبّاسی کے دھیان سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں اترتا تھا۔ وہ سوتے سوتے چونک پڑتی۔ معلوم ہوتا نصیر ڈنڈے کا گھوڑا دبائے چلا آتا ہے۔ پڑوسنوں کے پاس جاتی تو نصیر ہی کا چرچا کرتی۔ اس کے گھر کوئی آتا تو نصیر ہی کا ذکر کرتی۔ نصیر اس کے دل اور جان میں بسا ہوا تھا۔ شاکرہ کی بے رخی اور بدسلوکی کے ملال کے لیے اس میں جگہ نہ تھی۔

وہ روز ارادہ کرتی کہ آج نصیر کو دیکھنے جاؤں گی۔ اس لیے بازار سے کھلونے اور مٹھائیاں لاتی۔ گھر سے چلتی۔ لیکن کبھی آدھے راستے سے لوٹ آتی۔ کبھی دو چار قدم سے آگے نہ بڑھا جاتا۔ کون منھ لے کر جاؤں؟ جو محبّت کو فریب سمجھتا ہو اسے کون منھ دکھاؤں! کبھی سوچتی، کہیں نصیر مجھے نہ پہچانے تو! بچّوں کی محبّت کا اعتبار کیا؟ نئی دایہ سے رچ گیا ہو۔ یہ خیال اس کے پیروں میں زنجیر کا کام کر جاتا تھا۔

اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ عبّاسی کا دل ہر دم اچاٹ رہتا۔ جیسے اسے کوئی لمبا سفر درپیش ہو۔ گھر کی چیزیں جہاں کی تہاں پڑی رہتیں۔ نہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی۔ بدنی ضروریات بھی خلاء دل کو پُر کرنے میں لگی ہوتی تھیں۔ اتفاق سے اسی اثنا میں حج کے دن آ گئے۔ محلّے میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے۔ عبّاسی کی حالت اس وقت پالتو چڑیا کی سی تھی۔ جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشہ کی تلاش میں ہو۔ اسے اپنے تئیں بھلا دینے کا یہ ایک بہانہ مل گیا۔ وہ آمادۂ سفر ہو گئی۔

آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی تھیں۔ دہلی اسٹیشن پر زائرین کا ہجوم تھا۔ کچھ گاڑیوں میں بیٹھے تھے۔ کچھ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ چاروں طرف اک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ دنیا اس وقت بھی جانے والوں کے دامن پکڑے ہوئے تھی۔ کوئی بیوی سے تاکید کر رہا تھا۔ ''دھان کٹ جائے تو تالاب والے کھیت میں مٹر بو دینا اور

باغ کے پاس گیہوں۔'' کوئی اپنے جوان لڑکے کو سمجھا رہا تھا۔'' آسامیوں پر بقایا لگان کی نالش کرنے میں دیر نہ کرنا اور دو روپیہ سیکڑہ سود ضرور مجرا کر لینا—'' ایک بوڑھے تاجر صاحب اپنے منیم سے کہہ رہے تھے۔'' مال آنے میں دیر ہو تو خود چلے جایئے گا اور چلتو مال لیجیے گا ورنہ روپیہ پھنس جائے گا۔'' مگر خال خال ایسی صورتیں بھی نظر آتی تھیں جن پر مذہبی ارادت کا جلوہ تھا۔ وہ یا تو خاموش آسمان کی طرف تاکتی تھیں، یا محوِ تسبیح خوانی تھیں۔ عبّاسی بھی ایک گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ان بھلے آدمیوں کو اب بھی دنیا کی فکر نہیں چھوڑتی۔ وہی خرید و فروخت لین دین کے چرچے! نصیر اس وقت یہاں ہوتا تو بہت روتا۔ میری گود سے کسی طرح نہ اُترتا۔ لوٹ کر ضرور اسے دیکھنے جاؤں گی—یا اللہ! کسی طرح گاڑی چلے۔ گرمی کے مارے کلیجہ بھُنا جاتا ہے۔ اتنی گھٹا امڈی ہوئی ہے۔ برسنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ معلوم نہیں یہ ریل والے کیوں دیر کر رہے ہیں؟ جھوٹ موٹ اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ چٹ پٹ گاڑی کھول دیں۔ مسافروں کی جان میں جان آئے۔ یکا یک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لیے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور کپڑے تر تھے۔ وہ گاڑیوں میں جھانکنے لگے۔ عبّاسی محض یہ دکھانے کے لیے کہ میں بھی حج کرنے جارہی ہوں، گاڑی سے باہر نکل آئی۔ صابر حسین اسے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئے اور بولے —'' کیوں عبّاسی! تم بھی حج کو چلیں؟''

عبّاسی نے فخر یہ انکسار سے کہا۔'' ہاں! یہاں کیا کروں؟ زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ خدا کے یہاں منھ دکھانے کے لیے بھی تو کوئی سامان چاہیے۔ نصیر میاں تو اچھّی طرح ہیں؟''

صابر: '' اب تو تم جارہی ہو۔ نصیر کا حال پوچھ کر کیا کروگی۔ اس کے لیے دعا کرتی رہنا۔''

عبّاسی کا سینہ دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر بولی۔'' کیا دشمنوں کی طبیعت اچھّی نہیں ہے؟

صابر: '' اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے جس دن تم وہاں سے نکلیں۔ کوئی دو ہفتہ تک تو انّا انّا کی رٹ لگاتا رہا۔ اور اب ایک ہفتہ سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ ساری

دوائیں کر کے ہار گیا۔ کوئی نفع ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ارادہ کیا تھا چل کر تمھاری منّت سماجت کر کے لے چلوں۔ کیا جانے! تمھیں دیکھ کر اس کی طبیعت کچھ سنبھل جائے لیکن تمھارے گھر پر آیا تو معلوم ہوا کہ تم حج کرنے جارہی ہو۔ اب کس منہ سے چلنے کو کہوں۔ تمھارے ساتھ سلوک ہی کون سا اچھّا کیا تھا؟ کہ اتنی جرأت کر سکوں اور پھر کارِ ثواب میں رخنہ ڈالنے کا بھی خیال ہے۔ جاؤ! اس کا خدا حافظ ہے۔ حیات باقی ہے تو صحت ہو ہی جائے گی ورنہ مشیتِ ایزدی سے کیا چارہ؟''

عبّاسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ دل سے دعا نکلی — ''اللہ میری جان کے صدقے، میرے نصیر کا بال بیکا نہ ہو۔'' رقّت سے گلا بھر آیا — ''میں کیسی سنگ دل ہوں پیارا بچّہ رو رو کر ہلکان ہو گیا اور میں اسے دیکھنے تک نہ گئی۔ شاکرہ بدمزاج سہی، بدزبان سہی۔ نصیر نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے ماں کا بدلہ نصیر سے لیا۔ یا خدا میرا گناہ بخشیو! پیارا نصیر میرے لیے ہڑک رہا ہے (اس خیال سے عبّاسی کا کلیجہ مسوس اٹھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے) مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے مجھ سے اتنی محبّت ہے۔ ورنہ شاکرہ کی جوتیاں کھاتی اور گھر سے قدم نہ نکالتی آہ! نہ معلوم! بچارے کی کیا حالت ہے؟ انداز وحشت سے بولی۔'' دودھ تو پیتے ہیں نا؟''

صابر: ''تم دودھ پینے کو کہتی ہو۔ اس نے دو دن سے آنکھیں تو کھولی نہیں۔''

عبّاسی: ''یا میرے اللہ! ارے اوقلی! قلی! بیٹا! آ کے میرا اسباب گاڑی سے اتار دے۔ اب مجھے حج وج کی نہیں سوجھتی۔ ہاں بیٹا! جلدی کر۔ میاں! دیکھیے کوئی یکّہ ہو تو ٹھیک کر لیجیے—''

یکّہ روانہ ہوا۔ سامنے سڑک پر کئی بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ عبّاسی بار بار جھنجھلاتی تھی اور یکّہ بان سے کہتی تھی۔'' بیٹا! جلدی کر میں تجھے کچھ زیادہ دے دوں گی۔'' راستہ میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اسے غصّہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا گھوڑے کے پر لگ

جاتے۔لیکن جب صابر حسین کا مکان قریب آ گیا تو عبّاسی کا سینہ زور سے اُچھلنے لگا۔سر تیورا گیا۔ بار بار دل سے دعا نکلنے لگی۔خدا کرے سب خیر و عافیت ہو۔

یکّہ صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا۔دفعتاً عبّاسی کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس کا کلیجہ منھ کو آ گیا۔سر تیورا گیا۔معلوم ہوا دریا میں ڈوبی جاتی ہو۔جی چاہا یکہ سے کود پڑوں۔مگر ذرا دیر میں معلوم ہوا کہ عورت میکے سے وِداع ہو رہی ہے۔تسکین ہوئی۔

آخر صابر حسین کا مکان آ پہنچا۔عبّاسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا۔جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم لڑکا شام کو بھوکا پیاسا گھر آئے اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں ہے۔دروازہ پر سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔باورچی بیٹھا حقّہ پی رہا تھا۔عبّاسی کو ذرا ڈھارس ہوئی۔گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولس پکا رہی ہے۔کلیجہ مضبوط ہوا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی تو اس کا دل گرمی کی دوپہری دھوپ کی طرح کانپ رہا تھا۔شاکرہ نصیر کو گود میں لیے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔غم اور یاس کی زندہ تصویر۔

عبّاسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا۔نصیر کو اس کی گود سے لے لیا اور اس کے منھ کی طرف چشم پُرنم سے دیکھ کر کہا۔''بیٹا!نصیر! آنکھیں کھولو۔''

نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ایک لمحہ تک دایہ کو خاموش دیکھتا رہا۔تب یکا یک دایہ کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا— ''انّا آئی۔انّا آئی۔''

نصیر کا زرد مُرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جائے۔ایسا معلوم ہوا گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔صبح کا وقت تھا۔نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔صابر حسین نے آ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار کرکے بولے۔''تمھاری انّا کو مار کر بھگا دیں؟ نصیر نے منھ بنا کر کہا۔''نہیں روئے گی۔''

عبّاسی بولی ''کیوں بیٹا! مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب کون دے گا؟''

صابر حسین نے مسکرا کر کہا— ''تمھیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہوگیا۔ اس حج کا نام حجِ اکبر ہے۔''

منشی پریم چند

مشق

لفظ و معنی

حلیم	:	برداشت کرنے والا، نیک مزاج کا، رحم کرنے والا
تردید	:	کسی چیز یا کسی بات کو غلط ٹھہرانا
اشک ریزی	:	آنسو بہانا
مناظرہ	:	بحث، مباحثہ
اشتعال	:	غصّہ، بھڑک اٹھنا
تضحیک	:	ہنسی اڑانا
تعریض	:	اعتراض کرنا
رکیک	:	بہت باریک، کم قیمت، چھچھورا
عفونت	:	بدبو، بساند
بے ضرر	:	جس سے کوئی نقصان نہ ہو
استخوان	:	ہڈّی

© NCERT not to be republished

لیل	:	رات
نہار	:	دن
رطوبت	:	نمی، تری
قلق	:	افسوس
سنگریزہ	:	کنکری
زائر	:	زیارت کرنے والا
مشیتِ ایزدی	:	اللہ کی مرضی
کوزہ	:	مٹی کا پیالا
شائبہ	:	ہلکا سا نشان، لہٰذا ہلکا سا شبہ یا شک
خطاوارانہ	:	قصور کرنے والے کی طرح
احتظاظ	:	لطف اٹھانا، مزہ لینا

غور کرنے کی بات

- اس افسانے میں منشی پریم چند نے متوسط طبقے کے مسلم گھرانے کی روزمرہ زندگی کی عکّاسی کی ہے۔
- افسانے کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں مصنف نے عورت کی 'ممتا' کو موثر انداز میں پیش کیا ہے۔
- افسانے میں عورتوں اور بچّوں کی نفسیات کو بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔
- مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ صرف مذہبی فرائض ادا کرنے سے ہی ثواب نہیں ملتا بلکہ انسانی حقوق کی ادائیگی بھی عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔
- اس افسانے میں پریم چند نے خدمتِ خلق کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ جس کا درجہ اور ثواب بعض حالات میں عبادت سے بھی بڑھ کر ہوجاتا ہے۔

- یہ افسانہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ غریب اور مجبور لوگوں کو کمتر نہیں سمجھنا چاہیے۔ یہ انسانی زندگی کا ایک اہم اور ضروری حصّہ ہوتے ہیں۔

سوالوں کے جواب لکھیے

1. شاکرہ عبّاسی سے کیوں ناراض رہتی تھی؟
2. نصیر کی بیماری کا کیا سبب تھا؟
3. عبّاسی نے حج پر جانا کیوں ملتوی کر دیا تھا؟
4. عبّاسی کی واپسی سے نصیر پر کیا اثر ہوا؟
5. صابر حسین نے عبّاسی سے یہ کیوں کہا:
"تمھیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہوگیا۔ اس حج کا نام حجِ اکبر ہے۔"

عملی کام

- افسانے کو غور سے پڑھیے۔
- ذیل میں دیے گئے محاوروں کے جملے بنایئے:
- خوشی سے پھولا نہ سمانا، آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا، کانٹوں میں پیر رکھنا، گلے کا ہار ہونا، طبیعت سیر ہونا
- افسانے کا مرکزی خیال بتایئے۔
- درج ذیل الفاظ کے متضاد لکھیے:

نفرت، سستا، ہوش، محبت، مہنگا، خوش، رونا، شیریں، ہنسی

- اس افسانے کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیے۔

© NCERT not to be republished